پروفیسر خالد شبیر احمد

قسط: ۳۰

ورق ورق زندگی

گورنمنٹ کالج سول لائن ملتان، اکتوبر (۱۹۶۲):

شاہ جی امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ ملتان چھوڑ کر اللہ کو پیارے ہو گئے تو میری سرکاری نوکری ملتان میں شروع ہوئی۔ اسلامیہ کالج میں پڑھا رہا تھا کہ مجھے بھی سرکاری نوکری کا پروانہ آ گیا۔ ایم۔ اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد میں نے سب سے پہلے پنجاب یونیورسٹی میں بطور لیکچرر نوکری کے لیے کوشش کی تھی۔ میں اس سلسلے میں اپنے کالج کے پرنسپل جناب تاج محمد خیال مرحوم و مغفور سے اُن کے آفس میں ملا۔ وہ اس وقت پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ بڑی اچھی طرح ملے۔ پوچھا کہ کیسے آئے ہو؟ میں نے عرض کیا کہ ایم۔ اے کر لیا ہے، اگر آپ کے زیرِ سایہ یونیورسٹی میں بطور لیکچرر جگہ مل جائے تو مجھے بڑی خوشی ہو گی۔ اُنہوں نے اپنے پی۔ اے سے کہا کہ اگر کہیں گنجائش ہے تو اسے یونیورسٹی میں لگا دیا جائے، یہ مجھے بہت عزیز ہے اور پھر یہ تو ہاکی میں ”یونیورسٹی بلیو“ بھی ہے اور تم جانتے ہو کہ مجھے کھلاڑیوں سے بہت زیادہ پیار ہے۔ پی۔ اے نے کہا کہ سر ابھی تو ایسی کوئی گنجائش نہیں ہے، ان کا پتہ نوٹ کر لیتے ہیں اگر کہیں گنجائش نکلی تو ترجیح انھی کو دی جائے گی۔ میں نے اس کے بعد لاہور ڈائریکٹوریٹ میں اپنی درخواست دے دی۔ اسی درخواست کے تحت مجھے ۱۹۶۲ء میں گورنمنٹ کالج سول لائنز ملتان میں ملازمت کا آرڈر ملا تھا۔ میں دو چار دن تو اس بات کا فیصلہ نہ کر سکا کہ آیا مجھے یہیں پر کام کرنا چاہیے یا پھر اسلامیہ کالج چھوڑ کر سرکاری نوکری Join کر لوں۔ اس بارے میں مشورے کے لیے چند دوستوں کے ساتھ ملتان آیا اور حضرت مولانا سید ابوذر بخاری رحمۃ اللہ علیہ سے مشاورت ہوئی۔ میں نے اُنہیں عرض کیا کہ اگر سرکاری نوکری اختیار کروں تو پھر جماعت کا کام تو نہیں ہو سکے گا، جبکہ پرائیویٹ نوکری میں جماعت کا کام بھی چلتا رہتا ہے۔ آپ نے کہا کہ سرکاری نوکری کر لو۔ صرف مجلس شوریٰ کے اجلاس میں بطور مبصر شرکت اور معاونت کا فارم پر کر لینا باقی سب کچھ ہوتا رہے گا۔ چنانچہ اُن سے مشورے کے بعد میں نے اسلامیہ کالج کی نوکری چھوڑ کر ملتان گورنمنٹ کالج سول لائنز میں بطور لیکچرر کام کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن اس سے پہلے مجھے بھی میاں عبدالباری صاحب (پرنسپل اسلامیہ کالج) نے وہی کہا جو انھوں نے میرے دوست بھٹی صاحب سے کہا تھا جب اُنہیں سرکاری نوکری ملی تھی کہ اپنی جگہ آدمی دے کر چلے جاؤ تو مجھے اعتراض نہیں۔ چنانچہ میں نے بھی اسی طرح جیسے بھٹی صاحب نے مجھے اسلامیہ کالج خانیوال کے لیے تلاش کیا ایک دوست کو تلاش کیا اور اسے پرنسپل صاحب کے سپرد کر کے خود ملتان آ کر سول لائنز کالج کو Join کر لیا۔ یہ ۱۲/ اکتوبر ۱۹۶۲ء کی تاریخ تھی۔ اور اس وقت کالج کے پرنسپل غالباً پروفیسر تاج محمد تھے۔ خانیوال میں بچے چھوڑ آیا تھا۔ ان کی نگہداشت کے لیے چھوٹے بھائی ظہیر کو بلا لیا تھا وہ چند دن بچوں کے پاس رہے۔

ملتان آمد:

ملتان پہنچ کر سول لائنز کالج میں Joining Report دی تو پرنسپل صاحب نے پوچھا کہ رہائش کا کوئی انتظام ہے؟ میں نے کہا کہ نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ چند دنوں تک کالج ہاسٹل میں رہائش اختیار کرلو بعد میں کوئی مکان تلاش کر لینا۔ میری طبیعت طلباء کے ساتھ ٹھہرنے پر آمادہ نہ ہوئی۔ اب جو لیکچر دے کر پہلی بار کالج سے باہر آیا تو خیال آیا کہ رات کہاں ٹھہروں گا، میری تو شہر میں کسی سے جان پہچان بھی نہیں ہے۔

شاہ جی امیر شریعت قدس سرّہٗ کے فرزندانِ گرامی میں سے صرف حضرت مولانا سید ابوذر بخاری رحمہ اللہ سے ایک دو ملاقاتیں تھی اور پھر اُن سے ایسی کوئی بے تکلفی بھی نہیں تھی کہ ان کے دروازے پر جا پڑتا۔ اسی سوچ میں گم تھا کہ دفعتاً فاروق بھراڑہ یاد آ گئے۔ وہ میرے بچپن کے دوست عزیز بھراڑہ کے چچا زاد بھائی تھے۔ ایک دفعہ جب میں فیصل آباد سے خانیوال آنے کے لیے گاڑی میں بیٹھا تو ان سے ملاقات ہوئی تھی پوچھا کہاں کا ارادہ ہے تو کہنے لگے کہ آج کل ملتان ہوتا ہوں وہاں پر کسی سیٹھ کی نوکری کر رہا ہوں۔ ان سے جب رہائش کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے مجھے اپنی رہائش کے بارے میں مکمل بتایا تھا اور جگہ میرے ذہن میں تھی۔ گھنٹہ گھر سے کچہری روڈ پر ذرا آگے چل کے ایک گلی کے کونے پر۔ چنانچہ ان کے دروازے پر دستک دی تو نیچے آئے۔ بڑی اچھی طرح ملے، میں نے کہا کہ میں بھی ملتان آ گیا ہوں۔ سن کر خوش ہوئے، میں نے مدعا بیان کیا، کہنے لگے آپ اوپر چل کر خود دیکھ لیں بس ایک ہی کمرہ ہے جس میں ہم دونوں میاں بیوی رہتے ہیں اگر کوئی گنجائش ہوتی تو میرے لیے تو یہ اعزاز تھا کہ آپ میرے ساتھ رہتے ہیں۔ انہوں نے مجھے کھانا کھلایا اور کہا دوپہر کا انتظام تو کر دیتا ہوں، گھنٹہ گھر کے پاس میرے سیٹھ کا ایک مکان ہے جو دو بھائیوں کے درمیان متنازعہ بن چکا ہے۔ چابی میرے پاس ہے لیکن رات آپ یہاں پر نہیں ٹھہر سکتے کیونکہ دوسرا بھائی کہے گا کہ میرے سیٹھ نے مکان پر قبضہ کرنے کے لیے ایک آدمی کو وہاں ٹھہرا دیا ہے۔ بہرحال میں نے اس پر بھی اللہ کا شکر ادا کیا۔ ایک چارپائی اور تکیہ مجھے دے دیا گیا اور میں چارپائی پر دراز ہو گیا لیکن نیند کہاں، پریشانی کہ رات کو کہاں جاؤں گا۔ کبھی کسی مسجد اور کبھی کسی باغ میں سونے کے لیے سوچتا۔ انتہائی بے چینی کا عالم تھا کہ اتنے میں ایک اعلان سنا۔ لاؤڈ سپیکر پر اعلان کیا جا رہا تھا: آج ملتان میں پاکستان ہاکی ٹیم آئی ہوئی جو ملتان کی ٹیم کے ساتھ ایک نمائشی میچ کھیلے گی اپنے پاکستانی ہاکی کے کھلاڑیوں کو کھیلتے ہوئے دیکھنے اور اُن کی حوصلہ افزائی کے لیے میچ دیکھنے کے لیے ضرور تشریف لائیں۔ میچ کی جگہ وہی بتائی گئی جو میرے کالج کے ساتھ تھی جہاں امیر شریعت کا جنازہ پڑھایا گیا تھا۔ میں نے جب یہ اعلان سنا تو وقت گزارنے کے لیے میچ سے محظوظ ہونے کا سوچا۔

جب میں دوپہر وقت مقررہ پر گراؤنڈ پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ چودھری محمد امین، چودھری غلام رسول کے بھائی، پاکستان ہاکی پلیئر اختر رسول کے چچا پولیس انسپکٹر کی وردی پہنے، ایک کرسی پر براجمان ہیں۔ چودھری امین میرے اچھے دوستوں میں شمار ہوتے تھے۔ گورنمنٹ کالج فیصل آباد میں اکٹھے پڑھتے رہے اور اکٹھی ہاکی بھی کھیلی تھی۔ میں نے انہیں اپنی طرف

متوجہ کیا تو وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے کہنے لگے ”ارے شبیر تم کہاں؟“ میں نے کہا جہاں تم ہو وہیں میں بھی، میں ملتان آ گیا ہوں اور یہاں پر اس کالج میں نوکری مل گئی ہے۔ کرسی چھوڑ کر کھڑے ہوئے اور بغل گیر ہو گئے۔ اس اچانک ملاقات پر بڑی خوشی ہوئی۔ انھوں نے مجھے ساتھ والی کرسی پر بٹھالیا۔ میچ سے فارغ ہوئے تو کہنے لگے کہ اب کہاں جاؤ گے؟ میں نے جواباً کہا ”میں نے کہاں جانا ہے؟ کہہ تو چکا ہوں کہ جہاں تم وہیں میں بھی“ اور بتایا کہ آج ہی پہنچا ہوں اور ابھی رہائش کا بندوبست نہیں کیا۔ انھوں نے مسکراتے ہوئے میرا ہاتھ پکڑا اور کہا کہ چلو یہ بھی اچھا ہوا۔ کچھ روز اکٹھے رہ کر ایامِ ماضی کی یادیں تازہ کریں گے۔ وہ مجھے ڈریم لینڈ سینمانز د گھنٹہ گھر کے سامنے خواجگان کے کوارٹرز کی ایک لمبی قطار کے آخری کوارٹر میں لے گئے۔ باورچی رکھا ہوا تھا، کھانا کھلایا۔ میں نے کہا کہ یار کہیں مکان تلاش کرو، تمہاری بھابھی خانیوال اکیلی ہے، کہنے لگے مکان کا ملنا تو مشکل ہے البتہ تمھاری مشکل میری مشکل ہے۔ یہ کہہ کر وہ بستر پر لیٹ گئے، میں سمجھا کہ سو گئے کوئی آدھ گھنٹے بعد اچانک اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ میں نے کہا کیا بات ہے سوتے سوتے اٹھ بیٹھے ہو؟۔ کہنے لگے سویا ہی کہاں تھا تمھارے لیے رہائش ڈھونڈ رہا تھا اور وہ مجھے مل گئی ہے۔ کالج سے کل جب واپس آؤ گے تو اسی لائن کے آخری دو کوارٹروں کی چابیاں تمہارے ہاتھ میں ہوں گی۔

میں نے کہا کہ وہ کیسے؟ کہنے لگے ان دو کوارٹروں میں رہائش پذیر عورتوں کی اخلاقی شکایتیں آ رہی ہیں۔ مالکان نے ان کوارٹرز کو خالی کروانے کا کام میرے ہی سپرد کر رکھا ہے۔ خالی کروا کے تمھیں ہی دلوا دیتا ہوں مگر شرط یہ ہوگی کہ بھابھی کے آنے کے بعد میں روٹی تمھارے ہاں سے ہی کھاؤں گا۔ میں نے کہا روٹی کا بھی کوئی مسئلہ ہے میرے لیے تو تمھارے ساتھ رہنا ہی کافی خوش قسمتی ہے کہ یہاں پردیس میں تم جیسا جگری دوست پڑوس میں ملے گا۔ صبح اٹھ کر ناشتہ کیا اور کالج پڑھانے چلا گیا۔ واپس آیا تو واقعی وہ دونوں کوارٹروں کی سیڑھی پہ کھڑے میرا انتظار کر رہے تھے۔ کہنے لگے یہ لو چابیاں اور بھابھی کو جا کر لے آؤ۔ میں سیڑھیاں چڑھ کے اوپر آیا تو دو کوارٹر ایک دوسرے کے ساتھ، راستہ ایک ہی تھا اور وہ سیڑھیوں کا۔ دروازہ کھولا تو ایک کمرہ، کمرے کے آگے صحن اور ایک کونے میں غسل خانہ اور بیت الخلاء۔

میں دوسرے روز خانیوال گیا اور بیوی اور بچوں کو ساتھ لے کر آ گیا۔ اور چودھری امین صاحب کا پڑوسی بن گیا۔ میرا کوارٹر بالکل گلی میں تھا اور ان کا کوارٹر میرے کوارٹر کے سامنے تھا۔ آدھی رات کو نیچے سیڑھیوں والے دروازے پہ دستک ہوتی تو ہم جاگ اٹھتے۔ یہ وہ لوگ تھے جو ہمارے پیشہ ور ہائشیوں کے ملاقاتی تھے۔ اس مشکل کا حل میں نے یہ سوچا کہ گلی میں سیڑھیوں والے دروازے پر تختی لگا دی ”چودھری محمد امین انسپکٹر پولیس“ اور ساتھ چودھری صاحب سے کہہ کے دو پولیس والوں کی ڈیوٹی لگوا دی کہ وہ اس گلی میں رات کو آنے والے مشکوک لوگوں کا راستہ کاٹنے کا سبب بنے رہیں۔ چنانچہ رات کو جگانے والا یہ مسئلہ بھی حل ہو گیا اور ہم بڑے آرام سے رہنے لگ گئے۔

دوسری مشکل:

رہائش کا مسئلہ تو حل ہو گیا لیکن دوسری مشکل یہ تھی کہ اس وقت نوکری کے پہلے چھے ماہ تک تنخواہ نہیں ملا کرتی

تھی۔ جو کچھ تھا وہ تو خرچ ہو چکا تھا۔ گھر میں دو بچے اور بیوی، ضروری اخراجات کے لیے پاس کچھ نہیں تھا۔ لیکن میں کچھ زیادہ گھبرایا نہیں۔ ایک دفعہ فاروق بھراڑہ سے دس روپے ادھار لیے تو دوسری دفعہ دفترِ ختمِ نبوّت میں مولانا عبدالرحیم اشعر سے ملاقات ہوئی، میں فیصل آباد سے ہی اُن سے واقفیت رکھتا تھا جب وہ مجلس احرارِ اسلام فیصل آباد کے دفتر میں بطور آفس سیکرٹری کام کرتے تھے تو اُن سے پانچ روپے قرض لیے، کچھ دن اس سے کام چلتا رہا۔ جیسا کہ پہلے بیان ہوتا رہا ہے کہ جب بھی کوئی مسئلہ پیش آتا اللہ تعالیٰ غیب سے مدد کر دیتے تھے۔ یہاں پر بھی ایسے ہی ہوا، ایک روز کالج میں لیکچر دے کر فارغ ہوا تو ایک شاگرد مجھے علیحدگی میں لے گیا اور مجھ سے میرا نام پوچھا۔ میں نے کہا کہ نام تو میں پہلے دن ہی بتا چکا ہوں، دو دن میں ہی بھول گئے ہو؟ کہنے لگا کہ میں پہلے دن نہیں آیا تھا۔ میں نے اسے اپنا نام بتایا۔ کہنے لگا کہ آپ کے کوئی دوست رجب علی وٹو ہیں؟ میں نے کہا کہ ہاں۔ رجب علی وٹو ساہیوال کے رہنے والے ہیں اور انھوں نے میرے ساتھ ہی ایم۔ اے کیا تھا وہ میرے بڑے اچھے دوست ہیں۔ کہنے لگا کہ میں آج کل اُن کے ساتھ ٹھہرا ہوا ہوں۔ میں نے اُنھیں آپ کے بارے میں بتایا کہ ہمارے نئے پروفیسر صاحب آئے ہیں۔ انھوں نے آپ کے قد و قامت سے لے کر چہرہ مہرہ پوچھا اور لباس تک پوچھ لیا تو مجھے کہنے لگے ”کل اُن سے ملنا اور اگر وہ اپنا نام خالد شبیر احمد بتائیں تو میرا اسلام کہنا اور کہنا کہ میں ڈریم لینڈ سینما کی کینٹین میں پچھلے پہر چار بجے کے قریب ان کا منتظر رہوں گا“۔ آپ ذرا آج ۴ بجے ان سے ملاقات کر لیں کیونکہ انہوں نے ملاقات کا کہا ہے۔ میں بہت خوش ہوا کہ نئے شہر میں ایک اور اچھا دوست مل گیا۔

چنانچہ ڈریم لینڈ سینما (نز دگھنٹہ گھر) جو ہمارے کوارٹروں کے بالکل سامنے ہی تھا، کی کینٹین پر پہنچا تو وٹو صاحب بڑی بے تابی کے ساتھ میرا انتظار کر رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی اپنے بازوؤں کی گرفت میں لے لیا اور گرمجوشی سے بھینچنے لگے۔ چائے کی پیالی پر گفتگو شروع ہوئی تو یونیورسٹی کی پرانی باتیں تازہ ہوگئیں۔ میں نے پوچھا یہاں کیا کر رہے ہو؟ کہنے لگے میں نیشنل سیونگ سکیم اچھی خاصی نوکری جو کر رہا ہوں۔ پھر کافی دیر تک گپ شپ جاری رہی جانے سے پہلے دوبارہ ملنے کا وعدہ بھی ہوا۔ جب میں رخصت ہونے لگا تو سو سو کے تین نوٹ میرے ہاتھ میں تھما دیے۔ میں نے کہا یہ کیا؟ کہنے لگے کہ ابھی چھ ماہ تک تنخواہ تو تمھیں ملنی نہیں ہے۔ اس لیے ان سے گزارہ کرو جب تنخواہ ملے گی تو لوٹا دینا۔ میں گریز کر رہا تھا اور وہ اصرار، ضرورت مند میں تھا ہی۔ میں نے روپے رکھ لیے اور یوں دوسری مشکل بھی حل ہوگئی۔

کالج کے ہمکار:

کالج انتہائی کشادہ، عمارت خوبصورت اور دل نشین تھی۔ سٹاف سے پہلے روز رسمی تعارف تو ہو گیا تھا البتہ کچھ دنوں بعد خاص طور جن لوگوں سے بے تکلفی کے مخلصانہ تعلقات قائم ہوئے، ان میں فارسی کے جابر علی سید، عبدالخالق عزمی جو اردو کے پروفیسر تھے اور عابد صدیق جن کا مضمون بھی اردو ہی تھا، قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے پروفیسروں کے ساتھ بھی اچھی سلام دعا تھی مگر بے تکلفی نہیں ہوئی۔ مثلاً پروفیسر مسعود جغرافیہ کے اور سبطین نقوی عربی کے استاد تھے۔

مرزا مبارک اردو میں تھے، فیصل آباد کے رہائشی تھے اس لیے ان سے بھی بات چیت ہوجاتی تھی۔ پروفیسر نظام خان بڑے خوش مجلس آدمی تھے۔ ان کی ٹیبل ٹاک بڑی پُرلطف ہوتی تھی۔ ہر ایک اُن کے پاس بیٹھ کر لطف اندوز ہونے کی کوشش کرتا تھا۔ اُن کا مضمون فلسفہ ونفسیات تھا۔ بعد میں عبدالرحمٰن شاکر جو فیصل آباد سے تعلق رکھتے تھے وہ بھی ہم میں آن ملے تو دوستی کا حلقہ وسیع ہوگیا۔ فرخ درانی انگریزی کے پروفیسر تھے اور شاعری اردو میں کرتے تھے۔ وہ بھی ہمارے پاس کبھی کبھی بیٹھ جاتے۔ لیکن ہمارا حلقہ جو ہمہ وقت ہم نشینی کی راہ پر رواں ہوا، وہ یہی تھا۔ جابر علی سید، عبدالخالق عزمی، عابد صدیق، عبدالرحمٰن شاکر۔ پروفیسر زیدی بھی اچھے آدمی تھے لیکن وہ ہم میں بیٹھتے نہیں تھے۔ بجنور سے اُن کا تعلق تھا۔ وہ خاصا لیے دیے رہتے تھے۔ اس لیے ہم بھی انہیں اتنا ہی وقت دے پاتے جتنا وہ قبول فرماتے تھے۔ دل کے برے نہیں تھے مگر ان کی پروفیسر نظام خان سے بالکل نہیں بنتی تھی اور خان صاحب بھی ان کا ذکر بہت اچھے الفاظ میں نہیں کرتے تھے۔

جابر صاحب پہلے جابر علی جابر کہلاتے تھے۔ بعد میں جابر علی سید ہوگئے۔ دوستوں میں ایک دن یہ بات بھی زیرِ بحث تھی کہ جابر علی جابر سے جابر علی سید کیسے ہوگئے؟ معلوم ہوا کہ کچھ حضرات نے ازراہِ مذاق ایسی باتیں اُن سے کہہ دی تھیں کہ انہیں اپنے نام میں یہ تبدیلی کرنا پڑی۔ ایک صاحب نے کہیں کہہ دیا ”اُف حضرت علی دو جابروں کے درمیان“ تو کسی نے کہا کہ یہ کیا نام ہے جیسے ”لاہور ریجن لاہور۔“ انتہائی نازک خیال، تن آسان اور شگفتہ مزاج، علم وادب کے رسیا۔ ہر وقت عربی، فارسی، اردو اور انگریزی کے لفظ اُن کے ذہن میں کودتے رہتے تھے اور نہ خود چین لیتے نہ ہی جابر علی سید کو چین لینے دیتے۔ کچھ دنوں کے بعد ایک صاحب کوئٹہ سے تبدیل ہوکر ہمارے کالج آئے، نام اس وقت یاد نہیں۔ اردو ان کا مضمون تھا۔ وہ بھی بڑے عروضی تھے اسی وجہ سے بہت جلد جابر صاحب کے قریب ہوگئے۔ جب یہ دونوں حضرات مجلس میں عروض پر بات کرتے اور شعروں کی تقطیع کرتے تو میں کبھی ایک کے منہ کی طرف دیکھتا اور کبھی دوسرے کی طرف۔ علمِ عروض ان دونوں کو ایسے ازبر تھا جیسے حفاظ کرام کو قرآن پاک۔ پھر جب کسی مسئلہ پر دونوں میں اختلاف ہوتا تو بحث اور بھی دلچسپ ہوجاتی۔ ہماری مجالس میں عموماً بات چیت ادب پر ہی ہوتی۔ کبھی لطائف کا سلسلہ شروع ہوجاتا تو کیفیت ادب سے بے ادبی میں بھی تبدیل ہوجاتی تھی۔ عزمی صاحب انتہائی زیرک، اعتدال پسند اور پرلطف شخصیت کے مالک تھے۔ راہ چلتے کئی الفاظ کے تلفظ انہوں نے درست کرائے۔ کالج میں فارغ وقت کے علاوہ رات کو کسی ہوٹل میں بیٹھنے کا پروگرام بھی بن جاتا تھا۔ غالباً حسین آگاہی میں دہلی مسلم ہوٹل میں بیٹھا کرتے تھے۔ وہاں شہر کے دوسرے نامور شاعر اور ادیب بھی آتے جن میں خاص طور پر عتیق فکری، عرش صدیقی اور ارشد ملتانی قابلِ ذکر ہیں۔ ابنِ امیرِ شریعت سید عطاء المحسن بخاری سے بہت جلد ملاقات ہوتی اور چند دنوں میں ہم آپس میں گھل مل گئے جیسے برسوں سے اکٹھے ہوں۔ کبھی کبھی میں خود شاہ صاحب سے ہوٹل کی نشست میں آنے کی استدعا کرتا وہ مان جاتے۔ اور جس دن عطاء المحسن شاہ صاحب ہوٹل میں آتے محفل کا رنگ ہی مختلف ہوجاتا۔ ہر موضوع پر گفتگو کا لہجہ ہی بدل جاتا۔ یوں محسوس ہوتا کہ عطاء المحسن ایک ایسا مرکز اور محور ہے جس کے اردگرد محفل رنگ ورعنائی کے ساتھ سانس لے رہی ہے۔ عقیدہ، فقہ، حدیث، ادب، فارسی، عربی، اردو کلاسیکی

شاعری اور اگر عتیق فکری موجود ہوں تو پھر فلکیات، علم نجوم اور نہ جانے کیا کیا زیرِ بحث آتا۔ میں ان سب کے درمیان اگرچہ دم بخود بیٹھا رہتا تاہم بعض اوقات اپنی علمی استطاعت کے مطابق حصہ بھی لیتا تھا۔ بہر حال یہ مجھے محسوس ہونے لگ گیا تھا کہ ان میں اگر اسی طرح بیٹھتا رہا تو ان شاء اللہ بہت جلد بہت کچھ حاصل کرلوں گا۔

حضرت امیرِ شریعت کے تیسرے فرزند مولانا سید عطاء المومن بخاری سے بھی دوستی پہلی دوسری ملاقات میں ہو گئی۔ پچھلے ٹائم ان سے تقریباً یومیہ نشست ہوتی تھی۔ جب بھی ان سے گفتگو ہوتی تو یوں محسوس ہوتا کہ جیسے خلوص اور محبت کی مطہّر صراحتوں نے پورے ماحول کو اپنی گرفت میں لے لیا ہو، ان کی گفتگو کے بین السطور میں سچائی اور حق گوئی کی چمک جھلکتی نظر آتی تھی۔ انھوں نے مجھے اپنے ذاتی حلقۂ احباب سے بھی متعارف کرایا۔ کالج کے بعد ہم ایک دوسرے کے گھروں میں بھی ملتے لیکن رات کو کسی نہ کسی جگہ ہمارا مل بیٹھنا تو بہت ضروری ہوتا تھا۔ یہ سب لوگ بے پناہ صلاحیتوں سے مزین تھے۔ ذوقِ مطالعہ فطرت کی طرف سے انہیں وافر عطا کیا گیا تھا۔ یہی وہ لوگ ہی کہ دم آخر تک جنہیں بھولنا میرے بس میں ہی نہیں کیونکہ میرے جیسے کم علم شخص نے ان تمام سے بقدرِ ظرف استفادہ تو کیا لیکن احاطہ نہیں کرسکا۔ ان کے درمیان بیٹھ کر ادبی ذوق وشوق کی طرف توجہ مبذول ہوئی۔ تو ایسی ایسی باتیں سننے کو ملی کہ جو میرے حیطۂ علم سے کہیں دور تھیں۔

ہاکی کی طرف مراجعت:

دو سال تک تو ہاکی کھیلنے کا موقعہ نہیں ملا۔ کیونکہ ان کالجوں میں نہ کوئی گراؤنڈ تھا اور نہ ہاکی ٹیم۔ ملتان میں دونوں چیزیں میسر تھیں۔ گراؤنڈ بھی اور ہاکی ٹیم بھی۔ کالج ہاکی ٹیم کا انچارج بھی مجھے ہی بنا دیا گیا اور پھر لطف یہ کہ یارِ طرحدار پروفیسر عابد صدیق مرحوم بھی ان دنوں ہاکی باقاعدگی کے ساتھ کھیلتے تھے۔ ہفتے کو ہاکی کھیلنے کے بعد ہم دونوں گلڈ ہوٹل چلے جاتے اور رائیٹر گلڈ کے تنقیدی اجلاسوں میں شرکت کرتے جہاں ادیب حضرات اپنی تخلیقات کو برائے تنقید اہل علم کے سامنے پیش کرتے تھے۔ عرش صدیقی ان دنوں رائٹر گلڈ ملتان کے سیکرٹری تھے، وہی ایسے اجلاسوں کا اہتمام کرتے تھے۔ جابر علی سید کی علمی اور ادبی صلاحیتوں کا اظہار حلقۂ احباب سے باہر انھی اجلاسوں کے ذریعے ہوا۔ جابر صاحب کسی کمزور یا ساقط المعیار تخلیق کو کلام کیے بغیر جانے نہیں دیتے تھے۔ یوں محسوس ہوتا کہ ادیب اور شاعر وہاں پر تنقید کرنے والوں میں سب سے زیادہ جابر صاحب سے ہی خائف ہیں۔ بہر حال ادبی اجلاس اور ہاکی دونوں چلتے رہے اور میں ملتان کی معروف کلب ”ایگل ہاکی کلب“ کا باقاعدہ رکن بن گیا جو پورے ڈویژن کی نمائندہ ہاکی ٹیم تھی۔ دو دفعہ ملتان زون کی طرف سے نیشنل ہاکی چیمپئن شپ کھیلنے کا اتفاق بھی ہوا۔ بہر حال جتنا عرصہ ملتان میں رہا، ہاکی سے تعلق بھی برقرار ہی رہا۔

ہاکی کا شوق اور ادبی ذوق دونوں ساتھ ساتھ رہے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ادبی ذوق ہاکی کے شوق پر غالب آیا۔ ڈاکٹر تاثیر وجدان صاحب سے بھی اسی حوالے سے ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ وہ اگرچہ پڑھاتے دوسرے کالج میں تھے لیکن وہاں سے فارغ ہو کر ہمارے کالج ہی چلے آتے تھے اور دیر تک ہمارے درمیان بیٹھ کر علم وادب کے پھولوں سے ادبی محفلوں کو معطر کرتے۔ ان کے ساتھ بھی دوستی آخر دم تک رہی۔ انتہائی مخلص اور صاحب علم شخصیت کے مالک تھے۔

(جاری ہے)